جوگندر پال کے ذہن کے سراغ کی ایک جہت

پروفیسر عتیق اللہ

C-125، بسیرا اپارٹمنٹ، نورنگرا ایکسٹینشن، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025، موبائل: 9810533212

۲۳/اپریل کو دوسری برسی پر خراجِ عقیدت

یہ ایک بہت پرانی بحث ہے کہ تخلیق وتنقید میں کیا رشتہ ہے۔ سقراط تو تنقید کو ایک الگ فلسفیانہ ڈسپلن کہتا ہے اور ہمارے زمانے کا ایک اہم نقاد ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا کہنا ہے کہ تخلیق کے عمل کے دوران فن کار کو اپنی شخصیت کو روایت کے حوالے کرنا پڑتا ہے جبکہ نقاد کو معروضی اصولوں کے ایک سیٹ کے تئیں اپنے باطن کی آواز (Inner voice) سے دستبردار ہونا پڑتا ہے، لیکن وہ یہ بھی کہتا ہے کہ تخلیقی کارکردگی بھی ایک مشقت طلب عمل ہے جو کئی اعتبار سے تنقید کے عمل سے مماثل ہے۔ تخلیق کے عمل کے دوران اور تخلیق کی تکمیل کے بعد مصنف نظرثانی کے طور پر قطع و برید، چھان پھٹک اور جلا کاری کر کے اسے زیادہ سے زیادہ ایک قطعی منصوبہ بند شکل دینے کے درپے ہوتا ہے جو بذاتِ خود ایک عملِ نقد ہے۔ اس معنی میں وہ یہ سوال بھی کرتا ہے کہ اگر تخلیقی مشقت ایک تنقیدی عمل ہے تو کیا تنقید کو تخلیق کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس کا جواب واضح لفظوں میں یہ ہے کہ تخلیقی کارنامہ مقصود بالذات ہوتا ہے اور تنقید آپ اپنی ذات میں اس سے کسی حد تک ایک الگ چیز ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر سینٹ بیوو (Sainte-Beuve) کے اس دعوے کی یاد آتی ہے کہ شاعری کے لمس کو ایک شاعر ہی محسوس کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس اسکاٹ جیمس کا کہنا ہے کہ تخلیق کار اور تنقید نگار دونوں کا کام تنظیم نو یا تعمیر نو ہے۔ اوّل الذکر زندگی سے اخذ کردہ تاثرات کی تنظیم نو کرتا ہے تو ثانی الذکر ادب سے اخذ کردہ تاثرات کو از سر نو ایک تنظیم عطا کرتا ہے۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ جب دونوں ڈسپلن الگ صلاحیتوں کا تقاضا کرتے ہیں تو ارسطو کا استاد افلاطون بھی ایک شاعر تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اپنے استاد سقراط کے کہنے پر اس نے اپنی منظومات تلف کر دی تھیں اور اپنی ذہانت کو مکمل طور پر فلسفے کے لیے وقف کر دیا تھا کیونکہ سقراط کی نظر میں فلسفہ کا مرتبہ سب پر فائق ہے۔ شاعری تو سب سے ادنیٰ مقام یعنی چھٹے نمبر پر ہے۔ سچائی ہمیشہ بین بین ہوتی ہے۔ تنقیدی ذہن اور تخلیقی ذہن کو دو الگ خانوں میں رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم کسی ایسے صاحب مرتبہ شاعر کا تصور نہیں کر سکتے جو اعلیٰ درجے کی تنقید بھی کر سکتا ہے اور نہ کسی ایسے اعلیٰ درجے کے نقاد سے ہم یہ امید کر سکتے ہیں کہ وہ بہتر طور پر شاعری کا حق ادا کر سکتا ہے۔ گویا ہم دانتے، ٹالسٹائی، ڈرائڈن، آرنلڈ، ایلیٹ وغیرہ کی تنقید کو جھٹلائیں گے جو اعلیٰ درجے کا تنقیدی اور تخلیقی ذہن رکھتے تھے خود اردو میں حالی کے بعد اس نوعیت کی متعدد مثالیں ہیں۔

مغرب میں میلارمے، والٹر پیٹر، آسکر وائلڈ اور ڈی۔ ایچ۔ لارنس یا ہمارے یہاں فراق گورکھپوری، محمد حسن عسکری، انتظار حسین، ممتاز شیریں اور ان کے ساتھ جوگندر پال کی تنقید میں جو غیر رسمی پن مختلف علوم اور حوالوں سے بے نیازی، تنقید کی مستعمل زبان اور مختلف تصوراتِ نقد سے گریز اور اپنی ذات کا جو اقرار ہے، اس کا ذائقہ پیشہ ورانہ، مدرسانہ اور نک سک درست قسم کی تنقید کی ان مثالوں سے قطعاً مختلف ہے۔ جو پہلے تھیسس (دعویٰ) قائم کرتی ہے پھر بڑے احتیاط اور ہوش مندی کے ساتھ ایک ایک لفظ اور ایک ایک دلیل پھونک پھونک کر جمائی جاتی ہے۔ قاری کو بھی اس قسم کی تنقید کا مطالعہ بڑے غور وفکر کے ساتھ کرنا پڑتا ہے۔ جبکہ غیر رسمی تنقید کے لکھنے والے بنیادی طور پر تخلیق کار ہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی تنقید کا سرچشمہ بھی وہی ہے جو ان کی تخلیق کا ہے نیز ان کی تنقید در پردہ ان کی اپنی تخلیقی کاوشوں کا دفاع بھی ہے۔ انھیں تنقید لکھنے میں وہی سیرابی میسر آتی ہے جس کا تجربہ انھیں تخلیقی عمل کے دوران ہوتا ہے۔

جوگندر پال کا افسانوی فن جس طور پر غیر رسمی نوعیت کا ہے ان کی تنقید بھی تنقید کی جکڑ بندیوں سے آزاد ایک ایسے ذہن کا عمل ہے جسے صرف کہانی کا سبق دیا ہے۔ پال مرحوم کو دنیاداری آتی تھی، نہ مکاری و

ریاکاری کو انھوں نے پردہ بنایا تھا۔ نہ کسی سے شکوہ تھا نہ شکایت، بس ایک قلندرانہ شان تھی جوان کی کہانیوں سے باہر ان کی سرتاپا شخصیت کی بھی مظہر ہے۔ انتظار حسین یا عزیز احمد کی کہانی پر علم کا بار بھی محسوس کیا جاسکتا ہے، لیکن جوگندر پال کی کہانی اپنی ایک آزاد رَو پر قائم رہتی ہے۔ اس کا مزاج بھی درویشانہ ہوتا ہے۔ یہی بے محابا پن ان کے تنقیدی مطالعوں کی بھی شناخت ہے۔

پال مرحوم نے زیرِنظر تصنیف کا عنوان ہی 'بے اصطلاح' رکھا ہے۔ یعنی ان تکنیکی یا علمی اصطلاحات کے استعمال کو غیرضروری سمجھا ہے جو اکثر پڑھنے والے کے لیے روڑا بن جاتی ہیں۔ پال مرحوم نے کہانی کی طرح اس کا میدان بھی کھلا رکھا ہے۔ اگر تنقید کا ایک کام ادب کے تئیں انس پیدا کرنا ہے اور ادب کو پڑھنے کے لیے اُکسانا ہے تو پال مرحوم کے یہ مطالعے ہمیں ادب پڑھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ کھیل کھیل یا ہنسی ہنسی میں وہ ایسی پتے کی باتیں کہہ جاتے ہیں جس کی توقع ہم کسی ضابطہ بند نقاد سے نہیں کرسکتے۔ پال کے لیے اس آزمائش کے مرحلے کو عبور کرنا اس وجہ سے سہل تھا کہ باخبری کو انھوں نے واحد کلید نہیں مانا۔ بڑے اور حیرت انگیز کارنامے اکثر بے خبری کی توفیق میں ہوتے ہیں لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بے خبری بھی اسی مصنف کا وظیفہ ہوتا ہے جو باخبر ہوتا ہے۔ ایک باخبر ہی باخبری کو پرے ہٹا سکتا ہے۔ بے خبری اس کی باخبری کا ہی حاصل جمع ہوتی ہے۔ پھر باخبری کو بے خبری سے اور بے خبری کو باخبری سے الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا۔ پال مرحوم کے تنقیدی مطالعے کے قاری کے لیے بھی باخبری کی اتنی ضرورت نہیں کیونکہ بڑی آسانی سے وہ ان سے بھی کہانی کا لطف لے سکتا ہے۔

دراصل اس قسم کے مطالعے میں زبان کا اہم رول ہوتا ہے۔ علمی زبان کا بوجھل پن اسے راس نہیں آتا۔ اس میں ایک خاص نوعیت کی تیز فہمی، نکتہ سنجی (Wit)، شگفتگی، ذومعنویت، متناقض بالذات اقوال یعنی اقوال محال (Paradsxes) سے سابقہ پڑتا ہے۔ ان کے اہداف مزاح نگاروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ طنز تو ان کے شعار میں بھی شامل ہے، لیکن ظرافت ان کے سانچوں میں فٹ نہیں بیٹھتی۔ پال مرحوم کے یہاں زبان کا عمل ان تمام گروں کو آزمانے کا ڈھب جانتا ہے۔ ایک آزاد رو اور تلازمۂ خیال کے ایک بے قابو سلسلے کے تحت یہ ساری صورتیں واقع ہوتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملے، جس قسم کی دانش افروزی کے مظہر ہوتے ہیں اور لطافت و ذکاوت جن کا خاصہ ہوتا ہے ان میں برجستگی بھی بلا کی ہوتی ہے اور ان کی بلاغت میں بھی ایک تیکھا پن ہوتا ہے:

''گروہی وفاداریاں نیک نیتی سے ایک ہی کام انجام دے سکتی ہیں: مناظرہ بازی۔''

''غلام اشقلین کی کہانیاں تو آپ کو پکے راستے پر چڑھا کر سیمنٹ کی ویران بھیڑ سے بے دھچکا لہلہاتے دیہاتوں کے بیچوں بیچ لا کھڑا کرتی ہیں۔''

''نئی زندگی اگر بھوت کال سے باہر آچکی ہے تو بے تکی ترجیح اور تعصب کی بنا پر بار بار فینسی ڈریس شو کا انعقاد کیوں؟ بھوتوں پر کوئی تبھی باور کرتا ہے جب وہ کبھی کبھی دکھیں ورنہ بھوت ہی بھوت دِکھتے رہیں تو وہ سچ مچ کے لوگ دکھتے ہیں اور سچ مچ کے لوگ بھوتوں کے مانند اوجھل ہوجاتے ہیں۔''

''سیدھے راستے پر یہ پریشانی رہتی ہے کہ ہم گمراہ نہیں ہوتے اور بھٹک بھٹک کر ہمارا کسی ایسے مقام پر جا پہنچنا نہیں ہوتا جو ہمارے خواب وخیال میں بھی نہ ہو۔''

''کردار بے چارہ کہانی سے جڑا ہوتا تو اسے معلوم ہوتا کہ وہ کون ہے؟ جن کرداروں کے سروں پر کہانی کا ربھوت بن کر سوار رہتے ہیں انھیں کوئی واقعہ، کوئی خیال پیش نہیں آتا۔''

''پڑھنے والے کو اگر تنقید کی دعوے داری ہو تو وہ سورج کی شعاعوں میں روپوش ہوکر ندی کو کھارے پانیوں میں سے بوند بوند اڑا لیتا ہے اور پھر جب موسلا دھار برستا ہے تو ندی ایک انوکھی بہار لیے پھر چڑھ آتی ہے۔''

''نقاد کے اسی تخلیقی منصب کے مدنظر اسے ویشنو بھگوان سے منسوب کیا گیا ہے جو شعور کے سمندر میں سیس ناگ کی سیج پر سے کائناتی روابط پر نظر رکھے ہوتا ہے۔''

جوگندر پال نے کہیں کہیں اپنے معاصرین کے افسانوی فن پر بھی سیدھی اور کبھی کبھی ٹیڑھی نظر ڈالی ہے۔ خصوصاً انتظار حسین کا نام گزشتہ چھ سات دہائی سے ہمارے ذہنوں پر محیط ہے۔ افسانے کے پریم چند ساختہ فریم کو احمد علی اور عزیز احمد پہلے ہی توڑ چکے تھے اور یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ افسانے کے فن میں جو یکساں روی سی آگئی ہے اور

اس میں مُردنی کے جو آثار نمایاں ہونے لگے ہیں، اس کے لیے عضویاتی جراحی ضروری ہے۔ پہلے احمد علی نے میرا کمرہ اور موت سے پہلے جیسے افسانے لکھ کر اسے تازہ دم کیا پھر عزیز احمد نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ انھوں نے ایک چیلنج کے طور پر 'مدن سینا اور صدیاں'، 'تصورِ شیخ'، 'آبِ حیات'، 'جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں' جیسے افسانوں کے ذریعے نئی نسلوں کی جرأتوں پر مہمیز کا کام کیا۔ انتظار حسین، جوگندر پال، سریندر پرکاش یا غیاث احمد گدی کے تجربوں میں جن نئی آہٹوں کی گونج سنائی دیتی ہے، وہ آپ ہی آپ نمودار نہیں ہوئی اس کا ایک پس منظر ہے، لیکن ہر فن کار کے تخلیقی سفر میں ایک سہولت بخش منطقہ Comfart zone ضرور واقع ہوتا ہے جو ایک نشہ فراہم کرتا ہے وہاں ٹھہرنے میں بڑی فراغت اور طمانیت ہے۔ افسانہ نگار بار بار شیشے میں اپنا سراپا دیکھ کر مست والست ہونے لگے تو دنیا کچل کر بہت آگے نکل جاتی ہے۔ تخلیقی فن کار کو ایک مقام پر پہنچ کر خود کو اپنے پیروں سے کچلنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ انتظار حسین سے پال مرحوم کو یہی شکایت ہے اور بجا شکایت ہے:

''انتظار حسین اردو کا بہت اہم افسانہ نگار ہے، مگر داستانی، کتھائی لہجے کو اپنا تکیہ کلام بنا کر، اپنی زمین کو محصور کر کے اس چار دیواری میں وہ ہمیں ایک انہی لوگوں سے متعارف کراتا ہے، بلکہ ان سے ملتے ہوئے بھی یہی لگتا ہے کہ ایک انتظار حسین ہی داستانی بھیس میں بولے جا رہا ہے۔''

''یہ درست ہے کہ کہانیاں صدیوں بعد اساطیر کو جنم دیتی ہیں مگر خدارا اگر وہ کنواری اور اَن چھوئی رہ جائیں تو اساطیر کیا اپنے آپ پیدا ہو جائیں گے''

''وہ (منٹو) اپنی کہانیوں میں رنگ اور صدا کو کچھ اس طرح بسا لیتا ہے کہ قاری کو معلوم ہوتا ہے وہ انھیں پڑھنے کے بجائے جی رہا ہے۔ فن کی یہ اعجاز کاری کہ اس پر سرے سے فن کا گمان ہی نہ ہو۔''

''ترقی پسند تحریک منٹو کو پوری طرح اپنے سُر میں اتار نہ پائی اور بیدی کو سر میں اتار پانے کے باوجود اوائل اور درمیان میں اس سے بے اعتنائی برتتی رہی پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ منٹو، کرشن (جسے پال نے ترقی پسند افسانے کا دولہا کہا ہے) اور بیدی کی مثلث کے زاویے اولاً ترقی پسند آموختہ کی بدولت ہی افسانوی اقلیدس کے ایک نئے باب کا آغاز کرنے میں کامیاب ہوئے۔''

جوگندر پال نے تھوڑی سی شرارت، تھوڑے سے ٹھوکے، تھوڑی سی دردمندی اور تھوڑی سی در پردہ بیدردی کے ساتھ جا بجا پھلجھڑیاں سی چھوڑی ہیں۔ وہ ہمارے دور کے ایک بڑے افسانہ نگار ہیں، انھیں شہرت زیادہ ملی، سمجھا کم گیا۔ اکثر تنقید نگاروں کے لیے بیدی اور منٹو اور ان سے ذرا آگے بڑھے تو انتظار حسین ہی Status symbol بنے رہے۔ وہ یا تو اپنے نظریاتی غباروں میں ہوا بھرتے رہے یا ان کے آستانوں پر سر رگڑنے والوں سے آگے ان کی نظر مشکل ہی سے پہنچتی ہے۔ دراصل انسانی نفسیات بھی یہی ہے کہ وہ وہی دیکھتا ہے جسے وہ دیکھنا چاہتا ہے، وہی سنتا ہے جسے وہ سننا چاہتا ہے اور وہی پڑھتا ہے جسے وہ پڑھنا چاہتا ہے۔ پال مرحوم نے بڑی ذہنی کشادگی کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔ انھوں نے یہ تسلیم ہی نہیں کیا کہ اردو افسانے کا دم خطا ہو گیا ہے۔ نئی نسلوں میں انھیں وہ زندہ اور روبہ ارتقا دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ انھوں نے صرف ہندوستانی نئے افسانہ نگاروں کو اپنی بحث کا موضوع نہیں بنایا بلکہ پاکستانی افسانہ نگاروں سے بھی بڑی امیدیں وابستہ کی ہیں۔ مجھے ہمارے اس عہد میں کوئی ایسا نقاد نظر نہیں آتا جس نے اتنی ہمدردانہ فہم کے ساتھ نئے سے نئے افسانہ نگار کو قابلِ توجہ سمجھا ہو۔ ان کے لیے کسی تخلیقی فن کار کا پہلے مقتدر (Established) ہونا ضروری ہے۔ وہ اگر مقتدر نہیں ہے تو کون دماغ پاشی کرے، اس میں ساری محنت ضائع ہونے کا ڈر بھی ہوتا ہے۔ جیسے شمس الرحمٰن فاروقی کی قمر احسن کے باب میں ساری تجزیہ کاری اور دعوے داری خاک میں مل گئی۔

جوگندر پال کے ان مطالعات سے ذہن کو نئی روشنی، وجدان کو نئی سرگرمی اور قرأتوں کو نئی تحریک ملتی ہے۔ ان کے مطالعات قرأت نواز (Readable) ہیں، ہماری تنقید کی ایک بڑی کمزوری یہ بھی ہے کہ اس میں قرأت نوازی کا جوہر مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ نقاد اپنی بولی بولتا ہے خواہ اس بولی کا تعلق اس تخلیق سے ہو نہ ہو جس پر وہ خامہ فرسائی کر رہا ہے۔ بہر حال جوگندر پال کے ان مطالعات کو محض مطالعہ سمجھنا چاہیے۔ ایک ایسے ادیب کا مطالعہ جو خود ایک بڑا افسانہ نگار ہے اور جس کے ہر لفظ کی ایک قیمت ہے۔

○○